ادیب سہیل

چہار درویش

چینی سیاح فاہیان نے سرزمین بنگال کے متعلق کبھی کہا تھا کہ یہاں کے دریا، سبزہ زار، ندی، جھیل، بھیل غرض ہر شے گنگناتی اور گاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بنگال کا تصور نغموں کے بغیر محال ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ ایک شخص یہاں پیدا ہو، اس فضا میں پروان چڑھے یا عمرِ عزیز کے طویل عرصے گزارے اور اس کی نغمگی سے متاثر نہ ہو۔

بنگال کی اس نغمگی و موسیقی سے بھرپور فضا میں کلاسیکی رچاؤ جان عالم واجد علی شاہ کی کلکتے میں آمد سے مستحکم ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں تاج دار اودھ واجد علی شاہ جلاوطن ہوکر کلکتہ آئے۔ ان کی معیت میں ایک خلقت لکھنو سے آئی، اس میں ان کی بیگمات، محلات' متوعات، مصاحبین، خدام، درباری موسیقار و ساز کار (احمد خان، تاج خاں اور غلام حسین خاں) آئے، گورنمنٹ نے مٹیابرج کے مقام پر صرف عمارتیں، سلطان خانہ، اسد منزل اور مرصع منزل ان کے بود و باش کے لیے فراہم کیں مگر بادشاہ کے شوق نے ایسی بیسیوں عمارتیں اور باغات تعمیر کرواڈالے۔ گوشہ سلطانی، شہنشاہ منزل، شاہ منزل، نور منزل، تفریح بخش، بادامی، آسمانی، تہنیت منزل، حد سلطانی، سدِ سلطانی، عدالت منزل اور کئی دوسرے، مٹیابرج میں یہ دور دورہ ۱۸۸۷ء یعنی جان عالم بادشاہ کے انتقال تک کسی نہ کسی عنوان سے قائم رہا۔ گویا بادشاہ نے مٹیابرج میں کم و بیش ۳۱ برس قیام کیا، یہ عرصہ کم نہیں ہوتا، مٹیابرج ''چھوٹا لکھنو'' کہا جانے لگا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

> ''درحقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتہ کے پڑوس میں ایک دوسرا لکھنو آباد ہوگیا تھا۔ اصل لکھنو مٹ گیا تھا اور اس

Scanned by CamScanner

کی منتخب صحبت مٹیابرج میں چلی گئی تھی ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں لکھنو لکھنو نہیں رہا تھا۔ مٹیابرج لکھنو تھا۔"" مٹیابرج کے دکان دار اور مہاجن تک لکھنو کے تھے اور لکھنو کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔"

"نئے لکھنو" میں موسیقی کے شب و روز کے چرچے اور اس کے اثرات مٹیابرج تک کیسے محدود رہ سکتے تھے ۔سارا کلکتہ ان سے متاثر ہوا۔ یہ اثرات کلکتے سے نکل کر مرشد آباد اور دوسرے مقامات کے نوابوں اور راجواڑوں تک پہنچے۔ اس پس منظر میں آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۸۶۱ء میں آنکھیں کھولیں جب مٹیابرج کا واجد علی شاہی دور نصف النہار پر ہوگا اور مولانا ابوالکلام آزاد ۲۷ سال بعد ۱۸۸۸ء میں اس دنیا میں آئے یعنی جان عالم (واجد علی شاہ) کے انتقال کے ایک سال بعد، دونوں کو ورثے میں ایسی سرزمین ملی جس کا تصور بقول فاہیان نغموں کے بغیر مشکل ہے۔

جس شخص کو آگے چل کر ،نابغہ وقت میں شمار ہونا ہو، وہ کبھی یک جہت اور یک رخا ہو ہی نہیں سکتا۔ شروع ہی سے اس کے اندر بہت سی جہتیں پرورش پانے لگتی ہیں، اس کلیے کی روشنی میں جب ہم مولانا ابوالکلام آزاد اور رابندر ناتھ ٹیگور کا جائزہ لیتے ہیں تو بہت سی قدریں دونوں میں مشترک دکھائی دیتی ہیں اور بہت سی باتوں میں مماثلتیں نظر آتی ہیں ،وجوہ وہی ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا یعنی دونوں کو گاتی گنگناتی سرزمین سے گہرا لگاؤ ہے اور یہ سرزمین برصغیر میں سیاسی و ثقافتی دونوں اعتبار سے ایک عرصے تک ہراول کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ ٹیگور یہیں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے ،ابوالکلام صرف یہاں پیدا نہیں ہوئے مگر پروان اسی فضا میں چڑھے اور پھر چونکہ دونوں کا شمار وقت نے نابغہ کی حیثیت سے کیا ،لہذا انہیں یک رخا پن کبھی راس نہیں آ سکتا تھا۔ ان پر قلم اٹھانے والوں کے لیے بھی اچھا ہے کہ یک رخا نہ ہو۔ادب کے علاوہ فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں کی بھی شد بد رکھتا ہو۔

آنجہانی ٹیگور کی شخصیت وفن کا اگر سرسری جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف

Scanned by CamScanner

وہ بنگلہ کے عظیم شاعر تھے ۔ صاحب طرز موسیقار تھے ،مصوری سے ماہرانہ لگاؤ تھا، دوسری طرف وہ ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے بنگلہ ادب میں ہر زمانے کے بڑے ادیب'' گیتا نجلی'' لکھنے پر دنیا کے سب سے بڑے اعزاز و انعام''نوبل ایوارڈ'' کے مستحق قرار پائے۔ بہ حیثیت گیت نگار اور بہ حیثیت کمپوزر ان کی الگ شناخت''ٹیگور گیتی'' کے حوالے سے ہے۔

اس وقت کی پاکستانی حکومت کے وزیر اطلاعات ونشریات خواجہ شہاب الدین کے زمانے میں جب ان کی غلط حکمت عملی نے مشرقی پاکستان کے ابلاغ عامہ کے ذرائع ٹیگور کو تقریباً ادبی''دیس نکالا'' کا منصوبہ بنایا اور احکام جاری کیے تو سارے مشرقی پاکستان کا ادبی حلقہ چیخ پڑا، احکام کو واپس لینے کی دستخطی مہم چلی، اس مہم میں گنتی کے ہی سہی اردو ادیبوں نے بھی شرکت کی، بنگالی ادیبوں کے حلقوں نے علی اعلان یہ کہا کہ بنگلہ ادب سے ٹیگور کو نکال دینے کا مطلب یہ ہے کہ بنگلہ ادب آدھا رہ جائے گا۔ اردو ادیبوں پر اس وقت کے چیف سیکرٹری سابق مشرقی پاکستان حکومت کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنے دستخط واپس لے لیں۔ اردو ادیبوں نے کہا کہ اگر ہم اردو ادب سے رتن ناتھ سرشار، چکبست، پریم چند اور کرشن چندر کو نکال سکیں تو پھر ہمیں دستخط واپس لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

ابوالکلام آزاد صاحب طرز نثار تھے ،ایک عالم بے بدل، ایسے عالم جن کی مادری زبان عربی تھی اور جن کا فرمایاہوا مستند مانا جاتا ہے ۔ شاعری میں بھی وہ بند نہیں تھے۔ جب شعر و شاعری کا ان پر غلبہ ہوا تو ان کی نگاہ نوک پلک کی درستگی کے لیے شوق نیوی کی طرف گئی ۔(یہ زمانہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۳ء کو محیط ہے) یعنی اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس ہوگی ۔ اس زمانے کا ایک شعر ملاحظ فرمایئے:

وعدہ وصل بھی اک طرفہ تماشا کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

صغرسنی کے باوجود مولانا کی ہم عصری اور خط و کتاب مولانا حالی سے بھی

Scanned by CamScanner

رہی، جب وہ ،،لسان الصدق'' نکال رہے تھے ۔علامہ شبلی سے ۳۱ ربرس چھوٹے ہونے کے باوجود ان سے بھی مولانا کی ہم عصری تمام و کمال قائم رہی۔ یہ اس لیے ہوا کہ مولانا چودہ برس تک آتے آتے علمی اعتبار سے مکمل جوان نظر آنے لگے تھے ۔

چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد بنیادی طور پر تحریر و تقریر کے آدمی تھے ،لہذا ان کا بہت دیر تک شاعری ساتھ نہ دے سکی، لیکن شعر و شاعری کے ساتھ ان کا شغفت اور التفات برابر قائم رہا۔انہوں نے اپنے شعری سرمائے میں جتنا کچھ بھی چھوڑا اسے پڑھ کر ان کے اندر کے بڑے شاعر کا یقینی سراغ لگایا جاسکتا ہے اور بہت سے بھاری بھرکم دیوانوں پر بھاری ہے ۔مولانا نے کلکتے سے''البلاغ و الہلال'' نکالا جن کی خدمات علم و ادب اور سیاست سے کون واقف نہ ہوگا۔

مولانا موسیقی کی طرف راجع ہوئے تو باضابطہ طور پر اس فن کو سیکھنے لگے، اس فن کی طرف رجوع کرنے کی کہانی مولانا نے غبار خاطر میں مزے لے لے کر بیان کی ہے، آلہ موسیقی میں انہیں ستار پسند آیا چنانچہ مسیتا خان سے سیکھنے لگے، پانچ سال تک مسلسل اس کی مشق جاری رکھی اور افتادطبع کے مطابق اس پر ماہرانہ دسترس حاصل کی ۔مولانا موسیقی کی دل گدازی اور روح پروری سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

''آپ سے ایک بات کہوں۔ میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے
۔میں زندگی کی احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن
موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آواز خوش میرے لیے زندگی کا سہارا
دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے ۔
مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کردینا چاہتے ہیں
تو صرف اس چیز سے محروم کر دیجئے......''

ٹیگور نے جب تاج محل دیکھا تو عظیم یادگار کو نہ جانے کس کس عنوان سے محسوس کیا۔ ایک جگہ انہوں نے کہا''تاج محل کی شکل میں شاہجہاں کی آنکھ سے نیچے

Scanned by CamScanner

ہوئے آنسو مجسم ہو گئے ہیں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب ایک موقع پر آگرہ کا سفر کیا تو ان کے ذہن میں تاج محل کی سیر تھی چنانچہ وہ اپنے ستار بھی لے گئے تھے، آگے کی باتیں خود مولانا کی زبانی سنیئے:

''اپریل کا مہینہ تھا اور چاند بی بی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی تو چاند پردہ شب ہٹا کر یکا یک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاموش طور پر کوشش کر کے ایسا انتظار کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کیسے کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں......

آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بار ہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبد خاموش کی طرف نظر آٹھائی ہے تو اس کی (کے) لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے!''

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اگر فنون لطیفہ کو اپنا خاطر خواہ وقت دیتے تو وہ یہاں بھی کارنامہ کر گزرتے لیکن وہ ایسا کیوں نہ کر سکے اس کی بظاہر دو وجوہ نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مولانا کی بنیادی شناخت ایک متبحر عالم دین کی تھی ، اس رستے کے اپنے الگ تقاضے اور محدودات ہوتے ہیں، دوم یہ کہ وہ معاشرے کے ایک حساس فرد تھے۔ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات سے خود کو مختلف نہ رکھ سکتے تھے۔ وہ جس زمانے میں سانس لے رہے تھے ،اس میں ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں تھیں اور ہر طرف انگریزوں سے ہندوستان خالی کرانے کے نعرے گونج رہے تھے ،وہ مردِ حق آگاہ تھے اور ایسا شخص دور ابتلا میں خاموش نہیں رہ سکتا، اسے باطل کے خلاف صف آرا ہونا ہی پڑتا ہے لہذا مولانا کا جھکاؤ تن من دھن سے سیاست کی طرف

Scanned by CamScanner

ہو گیا۔ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینے کی سیاست کی طرف۔

یہیں سے ٹیگور کا راستہ مولانا سے مختلف ہوجاتا ہے، ٹیگور بھی ہندوستان کی آزادی چاہتے تھے ۔ ان کی تمام تر شاعری انسانیت کی علمبردار ہے اس کے باوجود ابوالکلام آزاد کی راہ اختیار نہ کرسکے ، نہ ہی وہ سو باش بوس کے رستے پر گئے۔ انہوں نے اپنے کو شعر و شاعری اور دیگر فنون لطیفہ تک محدود رکھا ، البتہ ان کا یہ کام بنگال کے باغی شاعر نذرالاسلام کے ذریعہ تکمیل پاتا رہا۔

مولانا ابوالکلام کو جہاں کہیں موقع ملا، فراخدگی سے ٹیگور کی عظمت کا اعتراف کیااور کہا" جدید ہندوستان کو قدرت نے ٹیگور جیسی جامع الصفات شخصیت عطا کی ، ٹیگور حقیقت میں قدرت کا عطیہ ہیں، ایک مرتبہ مولانا نے وشوا بھارتی یونی ورسٹی میں "ٹیگور اور ہندوستانی تعلیم" پر انگریزی میں ایک لیکچر میں "گرودیو" کے الفاظ، شانتم، شیوم ،ادوتیم کا حوالہ دیا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ ٹیگور کا کوئی اس قسم کا قول مولانا کے متعلق مل جائے لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ حالانکہ گرودیو ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو سور گباش ہوئے، اس طرح مولانا کو گرودیو کی ہم عصری اور ایک دوسرے کی جان کاری کے لیے لمبا عرصہ ملا۔ ممکن ہے انہوں نے اس بارے میں کچھ کہا اور میری رسائی ایسے اقوال تک نہ ہوسکی ہو۔ بہرحال مولانا کے متعلق ان کے ہم عصروں نے کیا کہا اس کی فہرست بہت طویل ہوسکتی ہے ، یہاں صرف نیاز فتح پوری کے اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں:

> " یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہوسکیں، وہ اس سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں حالانکہ وہ بہت وزنی و گران قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں ،ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہوسکے۔ وہ امکانات کیا تھے؟ ان کا تعین و صراحت آسان نہیں تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و معاملہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ

Scanned by CamScanner

اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہوتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہوسکتے تھے وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی اور بدیع الزماں ہوتے، اگر وہ مذہب، دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنالیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے، اگر محض علوم حکمیہ کیلیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم اور فیلسوف نہ ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی ونظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی، اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔ مولانا عجیب وغریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انہیں صرف الہلال، البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ)

یہ تو تھی ان کے ایک ہم عصر اور مداح کی رائے مولانا کے متعلق اور مولانا نے خود اپنے متعلق جو کہا ہے وہ اس ذکر میں اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے علامہ نیاز فتح پوری کے مذکورر بیانات کی بھی بہت حد تک تصدیق ہوجاتی ہے:

"بعض اوقات سوچتاہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہوجاتا ہے، مذہب، علوم وفنون، ادب، انشاء، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لحظہ نئی نئی بخششوں

Scanned by CamScanner

سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔"(ارمغان آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری)

یہاں میں یہ کہتا چلوں کہ مولانا اور ٹیگور میں قدر مشترک یا مماثلتیں تلاش کرنے کا محرک ۲۵ مارچ ۱۹۳۶ء کا یہ خط ہے جو آغا تبارک حسین نے اپنے دوست قاضی محمد حسین کو بڑا بازار کلکتے سے لکھا تھا۔ لہٰذا اس خط کے اندراج کے بغیر اگلی باتوں کی اہمیت واضح نہیں ہوگی۔

بڑا بازار، کلکتہ

۲۵ مارچ ۱۹۳۶ء

بنام قاضی محمد حسین

برادرم

السلام علیکم۔ کلکتہ کے سینما میں بنگال ٹاکیز پروڈکٹ تماشہ فیٹل نائٹ یا "بلا کی رات" دکھلایا جا رہا ہے۔ کریکٹروں کے نام ہندو زبان ابوالکلام کی اردو نہیں گاندھی جی کی "ہندوستانی" ہے۔ "الہلال" کے محرر اور "ترجمان القرآن" کے مولف نے مبلغ پانچ ہزار پیش کش پر اس کا مکالمہ لکھا ہے۔

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

ڈرامہ جان دار نہیں ہے لیکن مکالمہ نویس کا نام نامی اس کی ضمانت ہے کہ کمپنی فائدہ میں رہے گی اور ہر شہر میں تعلیم یافتہ مسلمان اس تماشہ کو یکبار ضرور دیکھے گا۔ گزشتہ ہفتہ پٹنہ میں ٹیگور کا بنگالی ڈرامہ" چترانگدا" دیکھا خدا کے فضل سے پچاس روپے والی نشستوں پر زیادہ مسلمان ہی براجمان تھے ۔مہا بھارت کی ایک کہانی زبانی نہیں سنائی گئی بلکہ رقص میں دکھلائی گئی۔ مکالمہ صرف دو تین جگہ مختصر برائے نام ہے ایک بات ہے میں نے اس شب کو الفسٹن پٹنہ کے اسٹیج پر رقص و سرود یعنی ناچ اور گانا کو بھی بالکل ہم آہنگ دیکھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ٹیگور اس میں خود بھی پاٹ کرتے ہیں یہ صرف اشتہار ہے ٹیگور اسٹیج پر چھپی حبہ

Scanned by CamScanner

میں ملبوس ایک آرام دہ کرسی کے اندر ملفوف گائن پارٹی کے ساتھ مدھم سروں میں کبھی کبھی گلا ملا دیا کرتے ہیں لیکن جناب اس کی پوتیاں یا پتلیاں خوب ناچتی ہیں سارا فسانہ ناچ ہی ناچ ہے۔ جس کو دیکھو تھرک رہا ہے بندہ عشق بھی ناچ رہا ہے اور'' خدائے عشق'' بھی۔ لیکن لباس حرکات و انداز میں ذرہ برابر بے شرمی اور بے حیائی نہیں تھی۔

کلکتہ کارپوریشن کا آج الیکشن ہے سرکاری دفاتر بند ہیں۔ مسلمان بائیکاٹ پر تلے ہوئے ہیں۔ سرت چند بوس کانگریس کی دہائی دے رہے ہیں، دیکھئے کیاانجام ہوتا ہے کئی دن ہوئے کا کوی صاحب کا ایک خط شکور کی وساطت سے مجھ کو ملا تھا میں نے تفصیل سے ان کو جواب دے دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر اس ماحول میں رہنا پسند ہو تو درخواست لکھ کر بھیج دو، کامیابی ناکامی میرے بس کی بات نہیں لیکن کچھ ووٹ تو آپ کے لیے بلاتکلف ریزرو ہو سکتے ہیں یہاں واہیات جگہ ہے کوئی شریف ایک روز گزارا نہیں کرسکتا۔

نیاز مند۔ آغا

مواد کے اعتبار سے یہ خط دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرا حصہ رابندر ناتھ ٹیگور سے متعلق ہے۔ آخر میں نجی باتیں ہیں۔ خط کے پہلے حصے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا نے'' بنگال ٹاکیز پروڈکٹ'' کے لیے اس کی فلم فیٹل نائٹ یا'' بلا کی رات'' کا مطالمہ لکھا ہے جس کے معاوضے کے طور پر انہیں پانچ ہزار کی رقم ادا کی گئی ، بقول آغا تبارک حسین ڈرامہ اگر چہ جان دار نہیں تھا لیکن شہر کے مسلمان تعلیم یافتہ افراد نے اس تماشے کو کم سے کم ایک بار محض اس لیے دیکھا کہ اس کے مکالمے مولانا ابوالکلام کے قلم کا نتیجہ ہیں، یہ کھیل کمپنی کے لیے سود مند اور منافع بخش یوں ہوا کہ کلکتے سے باہر بھی ہزاروں لوگ مکالمہ نویس کی حیثیت سے مولانا کا نام سن کر اسے اشتیاق سے دیکھنے گئے۔

خط کا دوسرا حصہ پٹنہ میں ٹیگور کے بنگالی ڈرامے'' چترانگدا'' کی نمائش سے تعلق رکھتا ہے۔'' چترانگدا'' مہا بھارت سے لی گئی کہانی ہے جسے الفنسٹن سینما کے اسٹیج پر رقص کے ذریعے پیش کیا گیا۔ کم الفاظ میں جس خوب صورتی سے آغا صاحب نے اس پیش کش

Scanned by CamScanner

کی منظر آرائی کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود آنجہانی ٹیگور بھی اسٹیج پر موجود رہتے تھے۔ گاہے گاہے گائن پارٹی کی آواز سے آواز بھی ملایا کرتے تھے۔ اس خط سے یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ ڈرامہ کس پارٹی کی جانب سے پیش کیا جا رہا تھا۔ لیکن "گرودیو" کی اسٹیج پر موجودگی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پارٹی خود انہی کی مرتب کردہ ہوگی جو کلکتے سے پٹنے گئی تھی۔

آغا تبارک حسین باضابطہ ادیب نہیں تھے۔ لیکن خوب صورت عبارت آرائی کا فن انہیں ودیعت ہوا تھا۔ مزاجا جہانیاں جہاں گشت تھے۔ کلکتے میں پشاور کے ایک معروف پھلوں کا کاروبار کرنے والے کاروباری فقیر محمد صاحب کے یہاں ملازم تھے لیکن وہ لوگ اور بعد میں ان کے صاحبزادے گل محمد، آغا صاحب کو گھر کے ایک بزرگ کا احترام دیتے رہے۔ اگر آغا تبارک حسین باضابطہ ادب کی طرف آتے تو یقیناً ایک صاحب طرز نثر نگار ہوتے۔ بڑی توانائی اور حسن ہے ان کی تحریروں میں، یہ تو معلوم نہیں کہ قلم کاری انہیں ورثے میں ملی تھی لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ پڑھے لکھے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، خلافت کی تحریک سے گہری دلچسپی تھی۔ بمبئی کے قیام میں مولانا شوکت علی مرحوم اور ان کے رفیق خاص مولانا عرفان سے قربت خاص رہتی تھی۔ عالم اسلام کے لیے آغا صاحب کے دل میں خاص درد مندی تھی، انہوں نے عالم اسلام کو مولانا عبدالقدوس ہاشمی جیسا سگا بھانجا عطا کیا۔ جن کے مستقبل کے لیے وہ ہمیشہ فکر مند اور کوشاں رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے دو صاحبزادگان سید متین ہاشمی اور ایس ایچ ہاشمی اور رینٹ ایڈورٹائزرز کراچی کے مالکان اور روح رواں ہیں۔

آغا تبارک حسین کے خطوط بنام قاضی محمد حسین اقتباس یا مکمل صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ قارئین خطوط کی شکل میں آغا صاحب کی نثر نویسی کی شگفتگی سے لطف اندوز ہو سکیں اور تیس کی دہائی کے آس پاس کے زمانے کے حال احوال کا بھی اندازہ ہو سکے۔

خط بنام قاضی محمد حسین مورخہ ۲۴/۹/۱۹۳۱ء کے اقتباس کے آخری سطور سے پتا

Scanned by CamScanner

چلتا ہے کہ کلکتہ میں کوئی وفد انجمن العرض آیا ہوا ہے۔ اس کی آمد کے فرض و غایت کے متعلق انکشاف کرتے ہوئے آغا صاحب لکھتے ہیں:

"اس وفد کو جو پانچ ہزار روپے کی رقم (اس دور کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی) دی گئی، ساتھ ہی مزید رقم مہیا کرنے کے وعدے کیے گئے۔ وہ کلکتہ کے باصفا لوگوں کی داد و دہش کا نتیجہ نہیں۔ اس میں سینما اسٹیج پر کجن بائی کے رقص و سرود کی آمدنی بھی شامل ہے۔"

واضح رہے کہ تیس کی دہائیوں میں کجن بیگم رقص و نغمہ میں ایک بہت بڑا نام تھا۔ شاعری میں ادا تخلص کرتی تھیں اور لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ اس دور کے تھیٹریکل اسٹیج کجن کے کارناموں سے بھرے پڑے تھے۔

ایک خط بنام قاضی محمد حسین ۱۹۴۸ء/۵/۲۰ کو لاہور سے لکھا گیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا تبارک حسین پاکستان کے قیام کے ساتھ لاہور آ گئے تھے:

۲۰-۵-۱۹۴۸

لاہور

برادرم

السلام علیکم

ڈاک کا نظم ایسا خراب ہے کہ ۵ مئی کا خط ۲۰ مئی کو ملا ہے، خدا ان فصل حق کو بخشے۔ اپنی محرومی پر افسوس و رنج ہے۔

آپ کا خط میں اکثر ایسا لفظ یا فقرہ ہوتا ہے کہ تڑپ جاتا ہوں اور جھلا کر فریاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ ہندوستان کی پوری زندگی کے سرمایہ میں آپ سے مرے لیے کیا باقی رہ گیا ہے، فقط دو محبوب شخصیت اور قیمتی شے، میں خاموش رہوں یا اپنے اوپر ماتم کروں، سرمایہ حیات کو کیوں کر فراموش کر سکتا ہوں۔ حق تعالیٰ ان دو محبوب کو سلامت رکھے مرے لیے یہی دو شخصیت کا نام ہندوستان ہے۔

Scanned by CamScanner

بچوں سے اتنے دور اور بیگانہ کہ تعارف کے لیے دادا کا نام معلوم کیا جائے کہ ہم میں ان میں کتنے دور کی مسافت ہے۔ جسمانی راحت کے سامان کی کمی نہیں لیکن صحت کا کوئی سوال نہیں ہے، آنکھ آپریشن کے لیے تیار نہیں ہے۔ زندگی بے سود اور بے بس۔

خدا آپ کو بچوں سمیت خوش رکھے، والدہ جمیل سلمہ کو بہت بہت سلام اور دعا، بچوں کو دعا۔

خط پشاور کے پتہ پر لکھئے، میں جہاں ہوں گا مل جائے گا، آنکھ کی مجبوری سے بہ تکلیف خط لکھ رہا ہوں۔

بغیر عنوان

جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اس کا ایک رخ یہ ہے کہ ہم اخلاقی حیثیت سے مسلسل انحطاط اور پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ نظام مصطفیٰ (اسلامی قانون کی ترویج) کی تحریک اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ چاہے دل میں کچھ اور ہو کسی بڑے سے بڑے شخصیت میں یہ جرات نہیں ہے کہ وہ تائید کے سوا اختلاف کا ایک حرف زبان پر لائے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ ان شاء اللہ تجربہ کے طور پر کچھ کام عنقریب شروع ہوگا، غیر ملکی دشمنان اسلام نے ہم کو ناکام بنانے کے لیے اپنی کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ فقط

☆☆

ایک عالمگیر تحریک یہ ہے کہ شرعی قانون کی ایک ایسی فقہ تدوین کی جائے جو اسلامی حکومتوں کے بغیر اختلاف لائق عمل ہو، جن میں موجودہ مشکلات کا شرعی حل موجود ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مکہ مکرمہ میں مرکزی دفتر قائم کیا گیا ہے، جہاں کچھ لوگ ریسرچ کر رہے ہیں، مرکزی دفتر نے تمام دنیائے اسلام سے علم وفضل کی بنیاد پر بارہ ماہرین انتخاب کیے ہیں جو مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر نئی فقہ کی تدوین کر سکے اور بغیر اختلاف ہر اسلامی حکومت کے لیے لائق عمل ہو۔ حسن اتفاق سے ان بارہ ماہرین میں دو آپ کے جانے پہچانے ہیں۔ (۱) ہندوستان کے مشہور عالم مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی (۲) سید عبدالقدوس ہاشمی

Scanned by CamScanner

ندوی۔ یہ بڑا علمی اعزاز ہے۔ مرکز سے ناموں کے اعلان کے بعد کراچی کے علمی اداروں کی جانب سے استقبالیہ اور ارباب علم وفضل کی جانب سے مبارک باد کے پیغامات عبدالقدوس کو موصول ہو رہے ہیں۔ مرکز سے طلبی کی تاریخ کا اعلان نہیں ہوا۔ فقط

آغا تبارک علی حسین

آغا تبارک حسین کے مذکورہ خطوط کے علاوہ اور بہت سے خطوط بھی موجود ہیں جن کے مخاطب قاضی محمد حسین موضع کونی برا اور نزہت ضلع گیا (بہار) کے نام ہیں۔ جو ایک اہم زمیندار، ایک بااثر شخص تھے، علاقے بھر میں وہ نزہتی گاندھی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف (پٹنہ) قاضی احمد حسین (مرحوم) کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہی قاضی احمد حسین نے ایک کتاب "میرا عقیدہ۔ ابوالکلام آزاد" مرتب کر کے شائع کرائی تھی۔ جو ابوالکلام شناسی میں ایک مفید ذریعہ ہے۔

قاضی محمد حسین اولڈ علی گیرین تھے۔ چند سال پیشتر نوے سال کی عمر میں کراچی کا انتقال کیا۔ وہ اپنی نواسی کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے، خاندان اور خاندان سے باہر دونوں بھائیوں کی بہت قدر ومنزلت تھی، اس کا ایک قابل بیان موقع آج تک بھولا نہیں۔

جدید نظم کے معروف شاعر وصحافی صلاح الدین محمد کی شادی میں شرکت کے لیے میں سید پور سے ڈھاکے آیا ہوا تھا۔ انہی دنوں قاضی محمد حسین صاحب اپنی بیٹی مسعودہ سے ملنے کے لیے ہندوستان سے آئے ہوئے تھے۔ صلاح الدین کو میں نے جب یہ بتایا کہ قاضی صاحب آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنی شادی میں شرکت کے لیے انہیں مدعو کیا۔ قاضی صاحب تقریب شادی میں شریک ہوئے۔ صلاح الدین کے والد جناب عبدالشکور نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ اتفاق سے اس تقریب میں ابن انشا، قدرت اللہ شہاب اور کئی اور شاعر بھی موجود تھے جو ان دنوں ڈھاکے میں تشریف رکھتے تھے۔ صلاح الدین کے سر پہ صافے باندھنے اور صافے کو اول اول دعاؤں سے مشرف کرنے کے لیے صلاح الدین کے والد نے قاضی صاحب سے درخواست کی، قاضی صاحب اپنی

Scanned by CamScanner

تک سے اٹھے، صافے کو چھوا اور دعا پڑھی، پھر ابن انشا اور دیگر حاضر شعرا نے فی البدیہہ سہرے کے چند اشعار کہے۔ دولہا صلاح الدین اور دولہن بانو اختر شہود، ایک شاعر اور دوسری افسانہ نگار خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور بھائیوں پر فدا ام عمارہ سہر بیم لہک لہک کر مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

سیاست میں قاضی صاحب کی تمام تر شہرت اور سالہا سال کی خدمات سرحد کے اس پار رہ گئیں۔ وہ صاحب علم تھے ان کی ایک کتاب "مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب" یادگار ہے جو ۱۹۵۳ء میں نیشنل مسلم یونی ورسٹی بک ڈپو دہلی نے چھاپی تھی۔ گاؤں میں ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس کی کتابیں اب خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ملکیت ہیں۔

اب یہ دونوں رفیق دیرینہ یعنی آغا تبارک حسین اور قاضی محمد حسین کراچی کی مٹی میں دفن ہیں اور ان کے تعلق سے جو خط شائع ہو رہا ہے وہ بیسویں صدی کی دو اہم ترین شخصیات مولانا ابوالکلام آزاد اور آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور کے کچھ اوجھل گوشوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ یہ خط اور اس کے علاوہ آغا صاحب کے دیگر خطوط بھی ادب و تاریخ کے مخفی منظرنامے کو سامنے لا رہے ہیں۔

دیکھئے یہ علمی گفتگو آغا تبارک حسین کے اس خط سے چلی جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں قاضی محمد حسین کے نام لکھا تھا لیکن بالآخر خط کے متن کے حوالے سے آغا صاحب اور قاضی صاحب بھی مضمون کا اہم حصہ بن گئے۔ قارئین کے ذہنوں میں دوران مطالعہ یہ سوال اٹھ سکتا تھا کہ آخر تبارک حسین اور قاضی محمد حسین کا تعارف کیا ہے؟ سوال کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات سے پہلے ہی اوپر کے سطور میں مفصل رقم کر دیا گیا ہے، اور میرے خیال سے یہ مضمون مکمل معلوم ہوتا ہے۔

...o.o...

Scanned by CamScanner